علامہ اقبال کی اردو غزل اور انسانی عظمت کا تصور

سعد اللہ کلیم

بشر کو اس کی فردیت کے حوالے سے اکائی تسلیم کرنے کے باوجود اس کے مرتبے کا تعین تب ہی ہو سکتا ہے جب ہم اسے کسی اجتماعی تہذیبی و معاشرتی سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھیں ، کسی نظریاتی اساس کی نسبت سے اسے شناخت کریں اور اس کے عروج یا زوال پر حکم لگائیں ۔ تہذیبی اور نظریاتی خلاء میں انسان کی صحیح پہچان بڑی حد تک نا ممکن ہے ۔ اس اعتبار سے شروع ہی میں ہمیں پیش نظر رکھنا چاہیے کہ علامہ اقبال جس تہذیبی کل میں رکھ کر انسان کے مقام اور مرتبے کا تعین کرتے ہیں وہ بنیادی طور پر اسلامی تعلیمات سے تشکیل پاتا ہے ۔ اس کے بعد یہ دیکھنا مناسب ہو گا کہ علامہ کو عظمتِ بشر کے موضوع سے کس قدر لگاؤ رہا ہے ۔ اس سوال کا جواب ہمیں ان داخلی و خارجی محرکات تک لے جاتا ہے جو علامہ کے اس موضوع سے لگاؤ کا سبب بنے ۔ اس بات کا اندازہ کہ علامہ کو اس موضوع سے کس قدر لگاؤ تھا اول تو اس بات سے ہو جاتا ہے کہ ان کے جملہ افکار کا مرکزی حوالہ خودی ہے اور خودی انسان ہی کے وجود میں جاری و ساری جملہ توانائیوں کا مرکزی نقطہ بھی ہے اور سر چشمہ بھی ۔ دوسرے جب ہم ان کی اردو غزل کا مطالعہ کرتے ہیں تو کم و بیش ستر یا اس سے زیادہ اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں انسانی عظمت کے واضح اشارات موجود ہیں ۔ اشعار کی یہ تعداد دیگر گوناگوں موضوعات کے تناسب سے خاصی بڑی تعداد ہے بالخصوص اس صورت میں کہ ستر یا اس سے زاید اشعار کا یہ انداز علامہ کی صرف اردو غزل تک محدود ہے جس کی مقدار ان کے مجموعی ، جملہ اصناف پر مشتمل اردو فارسی کلام کی نسبت سے کچھ زیادہ نہیں ۔

تیسرے اس موضوع کے ساتھ علامہ کے لگاؤ کا اندازہ اس طرح بھی کرنا چاہیے کہ یہ اگر واحد نہیں تو ان چند گنے چنے موضوعات میں سے ایک ہے جو ایک نہ ٹوٹنے والے تسلسل کے ساتھ بانگ درا سے لے کر ارمغان حجاز تک برابر موجود رہے ہیں۔ اس خصوصی لگاؤ کے جو خارجی محرکات علامہ کے آس پاس پھیلی ہوئی زندگی میں نظر آتے ہیں ان کا مشاہدہ ہم بر صغیر کے نسبتاً محدود دائرے سے شروع کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد جس طرح ہندی مسلمان انگریزوں سے مرعوب ہو کر ہر شعبۂ حیات میں ان کی پیروی کی طرف تیزی سے مائل ہو رہا تھا اور جس طرح اپنی تہذیب، اپنی تاریخ اور اس کے نتیجے میں خود اپنے آپ سے اس کا اعتماد اٹھتا جا رہا تھا اس کے پیش نظر لازم تھا کہ اگر ہندی مسلمانوں کو ایک قوم کی حیثیت میں زندہ رہنا ہے تو اس کے اعتماد کو بحال کیا جائے۔ برصغیر کے اس محدود مکانی دائرے سے آگے گزریں تو پورے عالم اسلام کے وسیع تر دائرے میں بھی اغیار سے ذہنی طور پر مرعوب ہو کر اپنے آپ سے اعتماد اٹھ جانے کی بیماری پھیل چکی تھی اس سطح پر مسلمانوں کو ملی حیثیت میں زندہ رکھنے کے لیے اسلام کی صداقتوں اپنی تہذیب و تاریخ اور اقدار و روایات پر ان کے اعتماد کو بحال کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ تیسرا بڑا دائرہ پوری دنیا اور پورے عالم انسانیت کو محیط ہے۔ علامہ کو اپنے آس پاس دور دور تک انسان عدم اعتماد اور عدم تحفظ کا شکار نظر آتا تھا۔ جنگ عظیم نے انسانیت کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ انسان کے بالمقابل اگر ایک طرف طاقتور انسان تھا تو دوسری طرف فطرت کی مہیب قوتیں تھیں۔ تیسری طرف انسان کی اپنی ایجاد کردہ مشینیں تھیں جن کا دباؤ اس کے اعصاب پر آئے دن بڑھتا جا رہا تھا۔ اس دباؤ سے نجات دلا کر مجموعی انسانیت کو کسی اعلیٰ تر نصب العین کی جہت میں متحرک رکھنا خود انسانیت کی بقا کے لیے ناگزیر تھا۔ ورنہ اندیشہ موجود تھا کہ ڈارون جیسے مفکرین کے زیر اثر انسان صرف نظری طور پر نہیں بلکہ عملی طور پر حیوانیت کی سطح پر سانس لینے لگے اور یہ منزل بہت دور نہیں رہ گئی تھی۔

علامہ کو اسلامی تعلیمات اور تہذیب و تاریخ کی برتری کا شعور ورثے میں ملا تھا جس پر ان کا خاندان اسلام قبول کر کے عملی شہادت ہم پہنچا چکا تھا۔ علامہ کے والد اپنے وقت کے ایک قابل احترام بزرگ

تھے اور لوگ دعا و برکت کے لیے ان کی طرف رجوع کرتے تھے ۔ گھر کا پورا ماحول مذہبی صوفیانہ ماحول تھا جس میں تلاوت کلام پاک کی گونج ہر وقت سنائی دیتی تھی ۔ یہ تمام فضا اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتی تھی کہ علامہ کے خیالات میں انسان کامل کے تصور کو راسخ کر دے ۔ جس تسور کی پرورش آفتاب نبوت کی ضیا پاشیوں کا صدقہ تھی ۔ (علامہ کی رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ، ایک مسلمہ حقیقت ہے ۔ اور محبوب ، محب کے تصورات کو جس طرح اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے وہ ایک مسلمہ نفسیاتی کلیہ ہے) چنانچہ یہ جملہ داخلی و خارجی محرکات اس بات کا تقاضا کرتے تھے کہ (۱) انسان کی برتری کو دیگر جملہ مخلوقات کے مقابلے میں فکری سطح پر ثابت کیا جائے ۔ (۲) انسان میں فطری طور پر موجود جذبۂ افتخار کو ٹھیک سمت میں آگے بڑھایا جائے ۔ پھر جس طرح علامہ کے کوائف کا تقاضا تھا کہ ان کا تصور انسان کامل قرآن پاک کی تعلیمات سے ابھرنے والی خلیفۃ اللہ فی الارض کی بشارت اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے روشنی اکتساب کرے ۔ اس طرح گھر کی فضا کا ایک تقاضا یہ بھی تھا کہ علامہ تصوف میں پہلے سے موجود و متشکل تصور انسان کامل سے ، جو شیخ محی الدین ابن العربی کے ہاں ''حقیقت محمدیہ'' کی اصطلاح سے موسوم ہوا ، اپنے ذہن میں بننے والے مرد کامل کے ہیولے کی فکری سطح پر تصدیق حاصل کرے ۔ اس کا ثبوت علامہ کا وہ مقالہ ہے جو ستائیس صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۰۰ء میں چھپ چکا ہے ۔ اس مقالے کا عنوان تھا :

''The Doctrine of Absolute unity as expounded by Abdul Karim Al-Jili''

عبدالکریم الجیلی کا تصور انسان کامل شیخ محی الدین ابن العربی کے حقیقت محمدیہ کے تصور ہی کا عکس ہے ۔ علامہ اقبال کے اپنے بقول یہی مقالہ ان کے پی ایچ ۔ ڈی کے مقالے کی بنیاد بنا ۔ علامہ کا ڈاکٹریٹ کا یہ مقالہ جب انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں چھپا تو اس ابتدائیہ میں پروفیسر ایم ۔ ایم ۔ شریف نے یہ لکھ کر کہ : ''اگر علامہ اقبال کو اپنے اس مقالے میں ترمیم کا موقع ملتا تو وہ شاید مختلف انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے'' ۔ شائقین اقبال سے اس مقالے تک پہنچنے کی گویا

خواہش چھین لی ۔ اس میں شک نہیں کہ خود علامہ نے بھی جب ان سے اس کا اردو ترجمہ چھاپنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا ۔ کچھ اسی قسم کا تاثر دیا تھا مگر جیسے کہ پہلے کہا جا چکا ہے علامہ کے بعض تصورات بانگ درا سے ارمغان حجاز کے دور تک مستحکم رہے اور انہی میں سے ایک ان کا عظمت بشر کا تصور تھا ۔ اس تصور میں موجود بہت سے عناصر کو اس مقالے میں شناخت کیا جا سکتا ہے ۔

علامہ کے تصور انسان کامل کے ماخذات کی تلاش میں ہمیں دور جانے کی ضرورت نہیں ۔ خود علامہ اقبال کی گواہی پیش کی جا سکتی ہے ۔ مثلاً میک ٹیگرٹ پر لکھے گئے مقالے میں انہوں نے یہ کہہ کر بہت سی غلط فہمیوں کو دور کر دیا ہے کہ ان کا تصور مرد کامل نطشے کی جگہ صوفیائے اسلام سے ماخوذ ہے اور اس سلسلے میں الجیلی پر لکھے گئے مقالے کو ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے ۔ میک ٹیگرٹ کے فلسفے پر علامہ کا یہ مقالہ جون ۱۹۳۶ء میں چھپا ۔ اسی طرح ڈاکٹر نکلسن کو ایک خط میں آپ نے اسی الجیلی پر لکھے گئے مقالے کا حوالہ دیا ہے اور اسے اس بات کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے کہ ان کا تصور مرد کامل صوفیائے اسلام سے ماخوذ ہے نہ کہ نطشے کے "سپر مین" سے ۔ یہ خط ۲۳ جنوری ۱۹۲۱ء کو لکھا گیا ۔[۱]

علامہ کے تصور عظمت بشر کی مزید بہتر تفہیم کے لیے بعض دیگر اقتباسات کو بھی سامنے رکھنا مفید رہے گا ۔ مثلاً light of relativity Self in the" کے عنوان سے علامہ نے جو مقالہ لکھا اس میں "Pattison Pringle" کے حوالے سے کہا ہے کہ انگریزی زبان میں دنیا اور انسان دونوں کی تخلیق اور اللہ تعالیٰ سے انسانی انا کا رشتہ واضح کرنے کے لیے صرف ایک لفظ "Creation" ہے جبکہ عربی زبان اس سلسلے میں زیادہ خوش قسمت واقع ہوئی ہے کیونکہ اس کے پاس اس مفہوم کے اظہار کے لیے دو لفظ ہیں : "خلق" اور "امر" ۔ پہلا لفظ قرآن پاک میں مادی کائنات کی اللہ تعالیٰ سے نسبت کو واضح کرتا ہے جبکہ دوسرا یعنی

۱۔ "Thoughts and Reflections of Iqbal" by Syed Abdul Vahid Printed by Sh. M, Ashraf Lahore 1964— P. 93

''امر'' انسانی انا[1] کا اللہ تعالیٰ سے واضح کرتا ہے۔ اس تعلق کی صحیح نوعیت کی وضاحت کرنا بہت مشکل ہے اور اس مشکل کو مولانا رومی سے بڑھ کر کوئی حل نہیں کر سکتا۔

(اس کے بعد علامہ نے مولانا رومی کا یہ شعر دیا ہے)

اتصال بے تخیل بے قیاس هست رب الناس را با جانی ناس[2]

اس تمام بحث میں علامہ نے بندے اور خدا کے باہمی رشتے کی نوعیت کو بیان کرنے کی مشکلات کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ خدا اور بندے کے تعلق کی سطح بہر طور وہ نہیں جو خدا اور مادی کائنات کے تعلق کی ہے۔ اس طرح گویا کائنات اور اس کی ہر شے پر انسان کی فضیلت طے ہو جاتی ہے۔

اس فضیلت کی اساس اس عقیدے پر قائم ہے کہ تمام فضیلتوں کا مالک و خالق اپنی ذات میں صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ چنانچہ ہر وہ شے جو اس سے جتنی قریب ہے اتنی اعلیٰ و برتر ہے اور اسی طرح ہر وہ شے جو اس کی ذات پاک سے جتنی دور ہے اتنی اسفل اور کمتر ہے۔ اگر تو انسان محض جسم سے عبارت ہے تو وہ بھی کائنات کی ان گنت اشیاء میں سے صرف ایک ''شے'' ہے۔ انسان کو ''خلق'' کے معنوی دائرے سے نکال کر ''امر'' کی حدود میں داخل کر دینے والی چیز ''روح'' ہے۔ جس کو ''روحی'' کہہ کر اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنے ساتھ قائم کر دی ہے[3]۔ بعض اوقات خیال گزرتا ہے کہ علامہ نے جس شے کو ''خودی'' کہا ہے وہ بھی کہیں اسی لفظ کی معنوی حدود میں تو داخل نہیں؟ علامہ بحث کے دوران انسانی برتری کی بنیاد اسی الوہی عنصر پر اٹھاتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک بار پھر مولانا رومی کی گواہی پیش کی ہے اور اس بات کو واضح کیا ہے کہ اصل چیز پیکر یا خارجی وجود نہیں بلکہ اس کے بطون میں موجود وہ نورانی حقیقت ہے جس سے خارجی پیکر ''ہست'' کی صفت سے موصوف ہوتا ہے۔

۱۔ قرآن پاک ۱۷-۸۵

۲۔ "Thoughts and Reflections"—صفحہ ۱۱۳ - ۱۱۴

۳۔ قرآن پاک ۱۵ : ۲۹ ۳۸ : ۷۲

پیکر از ما ہست شد نے ما از و   بادہ از ماست مست شد نے ما از و

یہ تمام بحث تیسرے خطبے میں ہے ۔ اسی خطبہ کے صفحہ ۱۱۰ پر مزید لکھا ہے :-

''بزم ہستی میں ہر کہیں خودی ہی کا نغمہ لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہا ہے اور ذات انسان میں اپنی معراج کمال تک پہنچ جاتا ہے ۔ قرآن مجید نے بھی اسی لیے حقیقت مطلقہ کو انسان کی رگ جاں سے قریب تر ٹھہرایا ہے[1] ۔ کیونکہ یہ حیات الٰہیہ ہی کا سیل ہے جو ہمارے وجود کا سر چشمہ ہے اور جس میں ہم موتیوں کی طرح پیدا ہوتے اور زندگی بسر کرتے ہیں'' خطبۂ اول بعنوان ''علم اور مذہبی مشاہدات'' کے صفحہ ۱۷ پر علامہ لقد خلقناء الانسان فی احسن تقویم ، ثم رد دنا اسفل سافلین[2] ، کے حوالے سے انسان کی عظمت کے ساتھ ساتھ اس کے آس پاس مخالف قوتوں کے حصار کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

''جس کو اپنی سب خامیوں کے باوجود فطرت پر تفوق حاصل ہے کیونکہ اس کی ذات ایک زبردست امانت کی حامل ہے ۔ وہ امانت جس کے متعلق قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ اسے آسمانوں ، زمین اور پہاڑوں تک نے اٹھانے سے انکار کر دیا تھا''[3]

اس کے بعد اس خطبے کے آغاز ہی میں ، جس کا موضوع ''خودی ، جبر و قدر ، حیات بعد الموت'' ہے ، علامہ فرماتے ہیں :

''چنانچہ تین باتیں از روئے قرآن ہمارے سامنے آتی ہیں اول یہ کہ انسان اللہ تعالٰی کا برگزیدہ ہے[4] ۔ ثانیاً یہ کہ باوجود اپنی خامیوں کے وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہے[5] ۔ ثالثاً یہ کہ وہ ایک آزاد شخصیت کا امین ہے ۔ جس کو اس نے خود اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر قبول کیا''

۱- قرآن پاک ۵۰ : ۱۶   ۲ : ۱۸۶

۲- ایضاً ۹۵ : ۴ ، ۵   ۳- ایضاً ۳۳ : ۷۲

۴- ایضاً ۲۰ : ۱۲۲   ۵- ایضاً ۲ : ۳۰

ہبوط آدم کا وہ تصور جو عہد نامۂ عتیق کے اثر سے اسلامی روایات میں در آیا ہے ، انسان کی تنقیص کرتا ہے (علامہ اس سے انکار کرتے ہیں - ان کے نزدیک) ''اس کا اشارہ اس تغیر کی طرف ہے جو شعور کی صاف اور سادہ حالت میں شعور ذات کی اولین جھلک سے اس نے اپنے اندر محسوس کیا - وہ خواب فطرت سے بیدار ہوا اور اس نے سمجھا کہ اس کی حیثیت خود بھی اپنی جگہ پر ایک سبب (علت) کی ہے''[1] -

یوں تو علامہ اقبال کے خطبات اور دیگر شعری و نثری تصانیف میں عظمت بشر سے متعلق جگہ جگہ اشارات موجود ہیں لیکن ہمارا یہ مطالعہ چونکہ اردو غزل تک محدود ہے ، اردو غزل کے حوالے سے اس کے جو خدوخال سامنے آتے ہیں ان کی شناخت اور ان کے ماخذات کا اندازہ کرنے کے لیے اس قدر اقتباسات کافی ہیں - اب ہم عظمت بشر کے سلسلے میں علامہ کی اُردو غزل کا براہ راست مطالعہ کرتے ہیں :

بانگ درا کے ابتدائی حصے میں علامہ کا انداز یہ رہا ہے :-

۱ وہ مشت خاک ہوں فیض پریشانی سے صحرا ہوں
نہ پوچھو میری وسعت کی زمیں سے آسماں تک ہے[2]

---

۲ وہ میکش ہوں فروغ مے سے خود گلزار بن جاؤں
ہوائے گل فراق ساقیٔ نا مہرباں تک ہے[3]

---

۳ حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی
مکاں نکلا ہمارے خانۂ دل کے مکینوں میں[4]

۱- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ - ترجمہ و حواشی سید نذیر لیازی بزم اقبال لاہور ۱۹۵۸ء - ص ۱۲۸
۲- کلیات اقبال اردو ، حصہ بانگ درا ص ۱۰۳
۳- ایضاً ص ۱۰۲ ۴- ایضاً ص ۱۰۳

۴ کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں ؟
کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں[1]

---

۵ جائے حیرت ہے برا سارے زمانے کا ہوں میں
مجھ کو یہ خلعت شرافت کا عطا کیونکر ہوا ؟[2]

پہلے دونوں شعروں میں بظاہر کچھ نہ ہونے کے باوجود انسان کی وسعتوں کو زمین سے آسمان تک اور صحرا سے گلزار تک محسوس کیا گیا ہے۔ تیسرے اور چوتھے شعر میں سے تیسرے شعر میں انسانی شرف کو اس بات پر منحصر قرار دئے جانے کا اشارہ ہے کہ انسان کا دل اللہ تعالیٰ کے جلوؤں کا امین ہے۔ جبکہ چوتھےشعر میں وحدت الوجودی ذائقہ زیادہ نمایاں ہے۔ شاعر نے عظمت بشر کو اس الوہی عنصر کے حوالے سے ادراک کیا ہے جو اس کے اندر ازل سے ودیعت کر دیا گیا تھا۔ پانچویں شعر میں انسان کے موجودہ زوال کے باوجود اس کے اشرف المخلوقات ہونے پر حیرت کا اظہار کیا گیا ہے۔

بانگ درا ہی کے دوسرے حصے میں جو ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کے کلام پر مشتمل ہے، عظمت بشر کے اعتراف کا انداز یہ ہے :-

کہاں کا آنا، کہاں کا جانا، فریب ہے امتیاز عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے، ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے[3]

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا[4]

پہلے شعر میں شاعر نے وحدت الوجود کے نواح میں رہتے ہوئے انسان کے نوری جوہر کے حوالے سے ہر شے میں اس (انسان) کی نمود کا اعلان کرکے عقبیٰ اور بے وطنی کی تراکیب و اصطلاحات میں انسان کے زمان و مکاں

۱۔ کلیات اقبال حصہ اردو بانگ درا ص : ۱۰۳
۲۔ ایضاً ص : ۱۰۰ ۳۔ ایضاً ص ۱۳۶
۴۔ ایضاً ص : ۱۴۱

سے ماوراء ہونے کے امکانات کو بیان کیا ہے ۔ جبکہ دوسرے شعر میں علامہ نے بندوں سے پیار کو (جو بالواسطہ طور پر خدا ہی سے پیار کی ایک صورت ہے) عبادت کا درجہ ہی نہیں دیا بلکہ افضل درجے کی عبادت قرار دیا ہے ۔ البتہ پیار کے قابل بندوں کی ایک شناخت بھی بتا دی ہے کہ وہ ''خدا کے بندے'' ہوں (عبدہ) نہ کہ صرف عبد ۔ خدا کی یہ بالواسطہ محبت ذہن کو غالب کے اس شعر کی طرف لے جاتی ہے جس میں ندیم دوست سے ہوئے دوست کا نشان پا کر بندگی بوتراب کو بمنزلہ بندگی حق قرار دیا گیا ہے ۔ علامہ خدا کے بندوں سے پیار کرنے والوں کی غلامی کا اعتراف کرتے ہوئے بیک وقت صعودی و نزولی دونوں جہتوں میں ذہنی تحرک کا اشارہ دیتے ہیں ۔ ایک بندے سے خدا کی طرف اور دوسری خدا سے بندے کی طرف ۔

بانگ درا کا تیسرا حصہ جو ۱۹۰۸ء کے بعد کے کلام پر مشتمل ہے اس میں فکری و فنی پختگی نے علامتی انداز اختیار کر لیا ہے ۔ بے ساختگی کی صفت مزید ابھر آئی ہے ۔ اس حصے میں طور ۔ شعلۂ سینائی ۔ ساز ۔ لے ۔ نغمہ وغیرہ الفاظ علامتی مفہوم رکھتے ہیں ۔ اگر اسی علامتی اسلوب میں بات کی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں علامہ کی سوچ ''پروانے'' سے ''جگنو'' تک کا سفر طے کر آئی ہے ۔ گویا اب علامہ اپنے آپ سے باہر کسی روشنی کی جانب لپکنے کی جگہ اسی روشنی کو اپنے اندر جذب کر کے انسان کو طالب اور شب کی بجائے مطلوب اور محبوب کی سطح پر محسوس کرنے لگے ہیں ۔

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثل کلیم!
اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر!

یہ شعر علامہ کے ذہنی سفر میں بہت اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اسی طرح جب وہ کہتے ہیں :

کیوں ساز کے پردے میں مستور ہو لے تیری
تو نغمۂ رنگیں ہے، ہر گوش پہ عریاں ہو[۲]

۱۔ کلیات اقبال حصہ اردو بانگ درا ص : ۲۷۹
۲۔ ایضاً ص : ۲۸۰

تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ علامہ انسان کی عظمت کا شعور رکھنے کے مرحلے سے آگے گزر کر اس عظمت کی طرف اپنے دور کو متوجہ کر کے انسان اور بالخصوص ہندی مسلمان کو خود اعتمادی کی راہ پر ڈالنا چاہتے ہیں - یہ وہ دور ہے جس میں علامہ ''ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا'' سے ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' تک آ پہنچے تھے -

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدۂ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی[1]

یہ علامہ کی اس غزل کا آخری شعر ہے جو انہوں نے سراج دکنی کی مشہور غزل :

''خبر تحیر عشق سن - - -'' کی زمین میں کہی ہے - مگر سراج دکنی کی غزل اور علامہ کی غزل میں فرق سکر و محو کا ہے - سراج نے جس سکر اور جذب و مستی کو اپنی غزل میں محفوظ کیا ہے ، علامہ کی غزل میں اس کی جگہ صحو کی حالت ہے ، ہوشمندی ہے - اور نفع نقصان کی اجتماعی سطح کا شعور ہے - سراج ہی کی بحر میں علامہ کی ایک اور غزل بڑی مقبول ہے :

''کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں''

اگرچہ اس میں ردیف قافیہ مختلف ہے تاہم اس سے اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ سراج دکنی کی غزل اس عہد تک بلکہ اس کے بہت بعد تک بھی اپنے جذب و جنون کی وجہ سے علامہ کی شخصیت کے کسی ایک عنصر کو گرفت میں لے رہی ہے - اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ علامہ کا رشتہ صوفیانہ انداز فکر سے قائم ہے - بالخصوص ''انسان کامل'' کے حوالے سے یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے - اس دور تک علامہ کا تصور عظمت بشر خودی سے آگے بڑھ کر بے خودی تک آ پہنچا ہے - عظمت بشر کا انفرادی سطح پر یقین اب اجتماعی سطح پر ملی اور قومی خودی تک اپنی حدود کو پھیلا رہا ہے -

---

۱- کلیات اقبال حصہ اردو بانگ درا ص : ۲۸۲

جہاں تک بال جبریل کی غزلوں کا تعلق ہے ان میں علامہ کے یہاں پہلے سے موجود عظمت بشر کے احساس میں مزید فکری بلوغت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں ۔ ساتھ ہی خود اعتمادی کا ایک ایسا لہجہ ابھر آیا ہے جیسے علامہ اس عہد تک اپنے افکار و خیالات کی مکمل تنظیم کر چکے ہوں ۔ بال جبریل میں انسان کا سینہ' اسرار حیات و کائنات کا صرف امین نہیں بلکہ خود ایک اسرار ہے جس کو سینہ' کائنات میں محفوظ کر دیا گیا ہو ۔ وہ اب اسے صرف ڈھونڈنے والا نہیں بلکہ ڈھونڈا جانے والا بھی ہے ۔ وہ منتظر بھی ہے ۔ اس کی رسائی عالم جذب و مستی میں صفات بُت کدے سے آگے حریم ذات تک بھی ممکن ہو گئی ہے ۔ جب وہ عاشقانہ حوصلہ مندی کو کام میں لاتا ہے تو دل وجود کو چیر کر آگے گزر جاتا ہے یہ حوصلہ مندی بال جبریل کی پہلی غزل ہی میں ہمیں متوجہ کر لیتی ہے ۔ علامہ کی لے کاری میں جمال پر بتدریج جلال غالب نظر آتا ہے ۔ انفعالیت بتدریج فعالیت کو جگہ دے رہی ہے ۔ ان کے لہجے میں غلامانہ شائستگی کی جگہ آزاد فرد کا اعتماد جھلکنے لگا ہے ۔ یوں تو یہ شعور اسلامی تعلیمات اور بالخصوص صوفیانہ مابعدالطبیعات کے حوالے سے پہلے بھی ان کی غزل میں موجود رہا ہے کہ عالم وجود کی تمام گہما گہمی اور ساری رونقیں انسان ہی کے دم قدم سے ہیں لیکن اس مرحلے میں یقین کی یہ سطح پختہ تر اور بلند تر ہو گئی ہے ۔

کچھ نمونے ملاحظہ ہوں :

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں !

میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں !

میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں[1]

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا ؟[2]

۱۔ کلیات اقبال حصہ اردو بال جبریل ص ۵/۲۹۷

۲۔ ایضاً ص ۶/۲۹۸

عالم آب و خاک و باد ! سترعیاں ہے تو کہ میں ؟
وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں ؟۱

قصور وار ، غریب الدیار ہوں ، لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد !۲

مقام شوق تیرے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد !۳

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ !۴

مرے خاک و خوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے ؟ تب و تاب جاودانہ !۵

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں۶

علامہ کے پیش نظر اب عظمت بشر کے تین زاویے ہیں ۔ ایک تو انسان کی یہ حیثیت و اہمیت کہ اسی کے دم سے سلسلۂ تخلیق میں آب و تاب اور رونق ہے ۔ دوسرے یہ کہ عالم خارج یا علامہ کی اصطلاح میں عالم رنگ و بُو انسان کے بالمقابل کوئی حیثیت نہیں رکھتا ۔ وہ ایک ایسا

۱- کلیات اقبال حصہ اردو بال جبریل ص ۲۸/۳۲۰
۲- ایضاً ص ۸/۳۰۰
۳- ایضاً ص ۸/۳۰۰
۴- ایضاً ص ۲۳/۳۱۵
۵- ایضاً ص ۱۵/۳۰۷
۶- ایضاً ص ۱۸/۳۱۰

جسد ہے جس میں انسان روح کی طرح کار فرما ہے۔ تیسرے یہ کہ نہ صرف ''عالم آب و خاک و باد'' سے انسان برتر ہے بلکہ ملائکہ پر بھی اسے برتری حاصل ہے۔

اگرچہ اس قسم کے تمام کلام میں بظاہر اللہ تعالیٰ کے حضور لہجے میں شوخی کا گمان گزرتا ہے۔ شاید اسی سے دھوکہ کھا کر بعض لوگوں نے یہ فرض کر لیا ہے یا اپنے کسی مفروضے کی علامہ سے تصدیق حاصل کرنا چاہی ہے کہ وہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے بالمقابل کھڑا کرکے عظمت کا تاج انسان کے سر پر رکھ دیتے ہیں۔ لیکن جب ہم (جیسے کہ پہلے کہا گیا ہے) اپنے احساس افتخار کی گرفت سے نکل کر علامہ کے افکار کا ٹھنڈے دل سے تجزیہ کرتے ہیں اور ان کے افکار کو جزوی طور پر دیکھنے کی جگہ ان کی کلی تعلیمات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ علامہ کا عظمت بشر کا تصور قرب و حضوریٔ باری تعالیٰ کی اساس پر قائم ہے۔ انسان کے پیکر خاکی میں قابل توجہ صرف ''ایک شے'' ہے جو خدا کی ہے اور جس کی نگہبانی انسان کو انسان بناتی ہے اگرچہ یہ کام بہت مشکل بھی ہے۔

اس پیکر خاکی میں اک شے ہے، سو وہ تیری
میرے لیے مشکل ہے اس شے کی نگہبانی![1]

انسانی برتری کی یہ اساس اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب ہم علامہ کے اس قسم کے اشعار سامنے رکھتے ہیں:-

یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی یا بندۂ خدا بن، یا بندۂ زمانہ[2]

یہاں انسان کی بڑائی کو علامہ نے واضح طور پر اس کے ''بندۂ خدا'' ہونے پر منحصر کر دیا ہے۔

اسی سلسلے کے کچھ اور اشعار دیکھیے:

ہے ذوق تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل! تو نرا صاحب ادراک نہیں ہے![3]

۱۔ کلیات اقبال حصہ اردو بال جبریل ص ۱۹/۳۱۱
۲۔ ایضاً ص ۵۸/۳۴۶ ۳۔ ایضاً ص ۳۳/۳۲۵

تو اے اسیر مکاں! لا مکاں سے دور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں[۱]

جہاں تمام ہے میراث مرد مومن کی
میرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک![۲]

بعض جگہ جہاں انہوں نے انسانی ارتقاء کی جہت کو واضح کرنا چاہا ہے - اسے افقی نہیں بلکہ صعودی دکھایا ہے - اس راہ میں آنے والے مراتب کی ترتیب یہ ہے :-

(الف) عالم رنگ و بو - (ب) ملائکہ (ج) انسان (د) خدا

سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا
ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب![۳]

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے
آدم کو سکھاتا ہے آداب خداوندی![۴]

اگر سمت درست نہ رہے تو تمام کوششیں منفی اثرات مرتب کرنے لگتی ہیں بلکہ جدوجہد کی رفتار کو جس قدر تیز کیا جائے اسی قدر انسان اپنی منزل سے دور ہوتا چلا جاتا ہے - علامہ نے جب اہل وطن کو یورپ کی سمت میں رواں دواں دیکھا تو انہیں یاد دلانا پڑا اور بار بار یاد دلانا پڑا کہ یورپ کے مقابلے میں ستارے ان کے نشیمن سے قریب تر ہیں - یہ بال جبریل کی آخری غزل کا شعر ہے - بال جبریل کے بعد اسی عنوان سے متعلق ضرب کلیم کی غزلوں میں سے ایک دو شعروں کا اور ان کے تصور عظمت آدم کے خدو خال کو مزید نکھارنے کے لیے ارمغان حجاز سے دو تین فارسی کے اشعار کا حوالہ مفید رہے گا -

---

۱- کلیات اقبال حصہ اردو بال جبریل ص ۵۰/۳۴۲
۲- ایضاً ص ۶۷/۳۵۹
۳- ایضاً ص ۷۹/۳۷۱
۴- ایضاً ص ۷۱/۳۶۳

تیرا زمانہ ، تاثیر تیری ! ناداں ! نہیں یہ تاثیر افلاک

ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے
جس نے سیے ہیں تقدیر کے چاک[۱]

اگر مقصودِ کل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے ؟
مرے ہنگامہ ہائے نو بنو کی انتہا کیا ہے ؟[۲]

ہنگامہ ہائے نو بنو کسی طلب کی دلیل ہے جو حصول کی منزل تک نہ پہنچی ہو ۔ اگر انسان اپنا مقصود آپ ہی ہوتا تو لازم تھا کہ خود کو پا کر پُر سکون ہو جاتا لیکن اگر اس کے باوجود انسان کو اطمینان میسر نہیں تو ثابت ہے کہ اس سے آگے بھی کوئی منزل ہے ۔ اور وہ منزل سوائے ذات و صفات باری تعالٰی کے اور کون سی ہو سکتی ہے ؟ مختصر طور پر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ تمام سلسلۂ کن فکاں کا مقصود ''انسان'' ہے مگر خود انسان کا مطلوب و مقصود اللہ تعالٰی ہے ۔ بشر کی عظمت کا اللہ تعالٰی سے کٹ کر علامہ کے ہاں کوئی تصور نہیں ملتا ۔

''نہ مارا در فراق او عیارے''

انسان اُس ذات پاک سے دور ہوکر اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اس بات کو بھی علامہ فراموش نہیں کرتے کہ :

''نہ او را بے وصال ما قرارے''

اگر صورت احوال یہ ہے کہ نہ انسان بغیر خدا کے رہ سکتا ہے اور نہ خدا کو انسان کے بغیر قرار ملتا تو پھر فراق اور وصال کی نوعیت کیا ہے ؟؟

۱۔ کلیات اقبال حصہ اردو ضرب کلیم ص ۱۱۳/۵۷۵
۲۔ کلیات اقبال حصہ اردو ارمغان حجاز ص ۵۰/۶۹۲

نہ او بے ما نہ ما بے او ! چہ حال است
فراق ما فراق اندر وصال است[1]

"نہ او بے نہ ما بے او"

یہی وہ مقام فضیلت بشر ہے جس کو ذہن میں رکھ کر علامہ نے ہمیں خبردار کیا ہے کہ :

آدمیت احترام آدمی با خبر شو از مقام آدمی ![2]

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

۱۔ کلیات اقبال حصہ فارسی زبور عجم ص ۱۵۷/۵۴۹
۲۔ کلیات اقبال حصہ فارسی جاوید نامہ ص ۲۰۵/۷۹۳